اردو کا عظیم طناز: مشتاق احمد یوسفی

مختار ٹونکی

کالی پلٹن روڈ، پل محمد خاں، ٹونک (راجستھان)

یادش بخیر! دیر سویر کی بات ہے کہ اچھے اچھوں کی چٹکیاں لینے میں ید طولیٰ رکھنے والے اور لفظوں کے تیروں سے گودنے، گدگدانے والے ''تکبیر'' کے مشہور عالم کالم نویس مشفق خواجہ المعروف بہ خامہ بگوش نے اپنی حاشیہ آرائی اور کالم نویسی کو لگام دیتے ہوئے لکھا تھا:

> ''کالم نگاری ترک کرنے کا تیسرا اور سب سے اہم سبب یہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''آب گم'' شائع ہوگئی۔ اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ نثر کیسے لکھی جاتی ہے اور طنز و مزاح کسے کہتے ہیں۔ یوسفی صاحب کو ہم عموماً نہیں پڑھتے کہ اُن کی چال چلنے کی کوشش میں ہم اپنی بھی نہ بھول جائیں، لیکن شامتِ اعمال سے ہم نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی اس رائے سے متاثر ہوکر کہ پچھلے سو برسوں میں اردو نثر میں ''آب گم'' جیسی کتاب نہیں لکھی گئی، یہ کتاب پڑھ ڈالی۔ کتاب پڑھنے کے بعد ہم پروفیسر صاحب کی رائے سے اس حد تک متفق ہوئے کہ خود موصوف کی تصانیف پر سو برس پہلے کی لکھی گئی کتابوں کا گمان ہونے لگا اور خود اپنی تحریریں ہمیں ان مصنّفین کی تحریریں نظر آنے لگیں جن کو لکھنے سے باز رکھنے کے لیے ہم کالم لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ''آب گم'' کی موجودگی میں ہم جیسوں کا طنز و مزاحیہ کالم لکھنا ایسا ہی ہے جیسے اقبال صفی پوری کا سہگل کی طرز میں غزلیں گانا۔''

خامہ بگوش نے خراجِ عقیدت پیش کرنے میں خفّت و خست سے کام نہیں لیا ہے بلکہ صاف صاف و اشگاف الفاظ میں ''آب گم'' جیسی لاجواب کتاب کے خالق کی تعریف کے پل باندھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آوازۂ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ یہاں تو دم بخود ہوکر خود صاحب ہوش خامہ بگوش ببانگِ قلم اعلان کر رہے ہیں کہ مشتاق احمد یوسفی زندہ باد اور ''آبِ گم'' پائندہ باد۔ ایک خامہ بگوش کیا یوسفی صاحب کے چاہنے والے تو اور بھی ہیں۔ ابن انشا نے بہت پہلے ارشاد فرمایا تھا۔ ''ہم دورِ یوسفی میں جی رہے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی بیسویں صدی کا بلکہ اکیسویں صدی کے اختتام کا مزاح نگار ہے۔'' اور مسٹر محمد حسن کی نظر میں مشتاق احمد یوسفی نثر کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ اِن کی آرا کی روشنی میں یہ تو بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں رہتے تھے، مگر سب آرا دہندہ کبھی کے مرکھپ گئے اور یوسفی صاحب بھی اب پیوندِ زمین ہوگئے۔ افسوس کہ وہ اپنی عمر کا سیکڑہ نہیں بتا سکے۔ انھوں نے بھی چاہے موت کا مزا چکھ لیا ہو، لیکن وہ اپنی تحریروں میں بہرحال زندہ ہیں۔ اس لیے ہم اردو کے اس عالمی مزاح نگار کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال نہیں کریں گے۔

واضح باد کہ یوسفی صاحب ظرافت کے نام پر رسوائے حکایت ہیں اور حقیقت بھی ہے کہ آج اقصائے عالم میں ان کے چرچے ہیں۔ ریگ زار راجستھان کے نخلستان ٹونک سے جست لگائی تو پاکستان پہنچے، وہاں سے زقند بھری تو انگلستان کے ٹاپو پر قدم جمائے اور پھر کراچی میں مزاح کے سپریمو کی حیثیت سے مشہور ہوکر اُبھرے۔ کچھ بھی ہو ان کے مزاح کی جہاں گیری نے ان کو بلاشبہ اورنگ زیب عالم گیر بنا دیا ہے کیونکہ ان کی چار مطبوعہ کتابوں ''چراغ تلے''، ''خاکم بدہن''، ''زرگزشت'' اور ''آب گم'' نے چار دانگ عالم میں ڈنکا بجا دیا ہے۔ یہ کتابیں طنز و مزاح کا ہی نہیں، ادب عالیہ کا بہترین نمونہ ہیں۔ انھیں اونچے اونچے انعام دلا چکی ہیں اور یونیورسٹیوں کے نصابوں میں داخل ہیں۔ جہاں اساتذہ و طلبا مل جل کر مزے لے لے کر ان کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنا سر بھی دھنتے ہیں۔ ان کی پانچویں اور آخری کتاب ''شام شعر یاراں'' گزشتہ سال شائع ہوئی جو بیسٹ سیلر بن کر مارکیٹ سے فوراً غائب ہوگئی۔ یہ بھی ان کی تحاریر یا توقیر کا جادو ہے۔ جادو جو قارئین کے سر چڑھ کر بولے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان پانچ مزاح کے صحیفوں میں کیا ہے کہ پڑھے لکھے ان کو پڑھ کر دیوانے مستانے ہوجاتے ہیں تو سنئے! یہ سب مشتاق احمد یوسفی کے قلم کی گوہر فشانی ہے اور فقط ان کے اسلوب کی

کارستانی ہے۔ اگر آپ کو ادبِ لطیف کی چاشنی چکھنی ہے تو انھیں پڑھیے، اگر آپ کو انشائیوں کی چٹنی چاٹنی ہے تو انھیں پڑھیے اور اگر آپ کو ملذّذ مزاح اور گرما گرم ظرافت کے بھرپیٹ چٹخارے لینا ہے تو بھی انھیں پڑھیے۔ یوسفی صاحب اوّل تو سطر در سطر ایسے ایسے فصیح و بلیغ جملے اور فکر انگیز فقرے رواروی میں لکھ جاتے ہیں کہ ہم برسوں اپنے ذہن پر زور ڈال کر بھی ایسے نتائج اخذ نہیں کر سکتے۔ بطور ثبوت ہم ان کے مٹھی بھر جملے بلاتبصرہ نقل کرتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ بھی بس سوچتے رہ جائیں گے:

۱۔ یوروپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے جب کہ ہم کسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹ نہ سکیں۔ مثال میں دری، گدیلے، قالین، جازم، چاندنی، چارپائی، کوچۂ یار اور پہلوئے دلدار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بدصورت انگریز عورت Rarity (نایاب) ہے۔ بڑی مشکل سے نظر آتی ہے یعنی ہزار میں ایک۔ پاکستانی اور ہندوستانی اسی عورت سے شادی کرتا ہے۔

۳۔ بھڑ کا زہر ڈنک میں رہتا ہے اور پاگل کتے کا زبان میں۔ انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔

۴۔ انگریز صرف اُن چیزوں پر ہنستے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں جیسے پنچ کے لطیفے، موسم، عورت، تجریدی آرٹ۔ اس کے برعکس ہم لوگ ان چیزوں پر ہنستے ہیں جو اب ہماری سمجھ میں آ گئی ہیں مثلاً انگریز، عشقیہ شاعری، روپیہ کمانے کی ترکیبیں، بنیادی جمہوریت۔

۵۔ مرد پہلے بحث کرتے ہیں پھر لڑتے ہیں، عورتیں پہلے لڑتی ہیں بعد میں بحث کرتی ہیں۔ مجھے ثانی الذکر طریقہ زیادہ معقول نظر آتا ہے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

۶۔ جوشؔ شاعری میں وصل کی فرمائش بھی اسی طور کرتے تھے جیسے کسی نادہند قرضدار سے ڈوبی ہوئی رقم ڈانٹ ڈپٹ کر وصول کرنا چاہتے ہیں۔

۷۔ منٹو کے افسانوں کا ترجمہ اگر مولانا آزاد کی جناتی زبان میں کر کے طوائفوں کو بالجبر سنایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک ہی صفحہ سن کر کان پکڑ لیں اور اپنے دھندے سے تائب ہو جائیں۔

۸۔ قہقہوں سے قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوتیں۔ چٹنی اور اچار لاکھ چٹخارے دار سہی، لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔

۹۔ میں دال اور سبزی اس لیے کم کھاتا ہوں کہ ہفتہ میں تین چار بار دال یا سبزی کھالوں تو نہ جانے کیوں خدا کو بھگوان کہنے کو دل کرنے لگتا ہے۔

۱۰۔ مسلمانوں کو کتوں سے چڑ ہے۔ اس کی کئی معقول وجوہ ہیں۔ دراصل مسلمان کسی ایسے جانور کو نہیں پالتے جسے ذبح کر کے اس کا گوشت وہ کھا نہیں سکتے۔

دوم یہ کہ ان کا اسلوب بھی حد درجہ مرغوب ہے۔ آپ ٹونک کے مشتاق مشتاقیا کو شوقیہ بھی پڑھیں تو حظ سے بہرحال ہمکنار ہوں گے اور لطف سے بہرطور دوچار ہوں گے۔ دراصل ان کے اسلوب اور اسٹائل نے ہی انھیں قطب مینار جیسی اونچائیاں عطا کی ہیں۔ ویسے تو اسلوب بیان کے اندر و باہر صاحب تحریر کی شخصیت کی جلوہ گری کسی نہ کسی طور پر ہو ہی جاتی ہے، لیکن خالص تخلیقی تحریروں میں مصنف کی شخصیت خصوصیت کے ساتھ نمایاں رہتی ہے اور طنز و ظرافت میں تو اسلوب ہی سر چڑھ کر بولتا ہے اور خوش فکری کے پردے کھولتا ہے۔ عام طور پر شعرا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے فتویٰ صادر کیا جاتا ہے کہ فلاں کو زبان و بیان پر حاکمانہ قدرت حاصل ہے اور فلاں الفاظ کے خلاقانہ استعمال پر چابکدستی رکھتا ہے۔ نثر میں تو اظہار کا طریقہ اور سلیقہ ہی سب کچھ ہے۔ عزت مآب یوسفی صاحب عالمی سطح پر کچھ یونہی مشہور نہیں ہو گئے ہیں بلکہ انھوں نے اپنے اسلوب سے اپنا لوہا منوایا ہے اور اپنی نفیس و لذیذ عبارت آرائیوں سے خود کو قد آور بنایا ہے۔ وہ اپنے قلم ظرافت رقم کو شگفتگی اور شائستگی کو لازم و ملزوم بنا کر قرطاس ابیض پر دوڑاتے ہیں اور زبان و بیان کے شائستہ برتاؤ اور الفاظ و تراکیب کے کاریگرانہ رچاؤ سے اپنی تحریروں کو پُر لطف بناتے ہیں۔ ان کا اسلوب معیاری ذوق پر دلالت کرتا ہے۔ کہیں بھی پھکڑ پن اور استہزا کی گنجائش نہیں نکلتی۔ دراصل اسلوب کی تشکیل زبان و بیان اور خیال و احساس کو آپس میں شیر و شکر کرنے سے مکمل ہوتی ہے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جس طرح محمد حسین آزاد کے طرز تحریر کی کوئی نقل نہیں کر سکتا اسی طرح مشتاق احمد یوسفی کا اسٹائل بھی لاکھ کوشش کرنے پر کوئی چرا نہیں سکتا۔ طنز و مزاح میں ان کی پیشکش زبان و بیان کی خوبصورتی اور طرز ادا کی دلکشی کا معیاری نمونہ ہوتی ہے۔ اُن کا اسلوب دانشورانہ اور ادیبانہ حدوں کو چھوتا ہوا خوش فکری، شگفتہ نگاری کے سدا بہار گل بوٹے کھلاتا ہے۔ سلیقۂ فن کو دیکھیے اور طریقۂ اظہار کو باریکی سے ملاحظہ کیجیے:

(i) ''چرچراتی ہوئی چارپائی کو میں نہ گل نغمہ سمجھتا ہوں نہ پردۂ ساز اور نہ اپنی شکست کی آواز درحقیقت یہ آواز چارپائی کا اعلان صحت ہے کیونکہ اس کے ٹوٹتے ہی یہ آواز بند ہو جاتی ہے۔''

(ii) ''اس صدی کی تیسری دہائی تک تو یہ حال تھا کہ اگر داغؔ کے کلام کے مجموعہ کی تمام کاپیاں تلف ہوجاتیں تو طوائفیں پورا کلام املا کرواسکتی تھیں.... اعلیٰ حضرت نظام دکن کے دربارِ دُربار میں جو تازہ غزل استاد داغؔ پڑھتے تھے وہ ایک ہفتہ میں سینہ بہ سینہ یعنی حسینہ بہ حسینہ رؤسا دلّی ولکھنؤ ورامپور تک پہنچ جاتی تھی۔''

''مزاح یوسفی'' کوئی عام چیز نہیں کہ ہر کوئی پڑھ لے اور نہ کوئی چیونگم ہے کہ ہر ایرا غیرا آسانی سے چوس لے بلکہ ادب کے لیے یہ ان کی خصوصی سوغات ہے اور یہ سو پیسے سولہ آنے کھری بات ہے کہ کوئی باشعور اور کلاسیکی ادبیات کا پڑھا کوقاری ہی اس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ یوں تو روتے ہوئے لوگوں کو عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، فرحت اللہ بیگ اور پطرس بخاری نے بھی اپنی گھریلو واقعات پر مبنی تحریروں سے خوب خوب ہنسایا ہے اور سڑی سہمی صورتوں پر کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی، کرنل محمد خاں، کرنل شفیق الرحمٰن، فکر تونسوی، یوسف ناظم وغیرہم نے مسکراہٹیں بکھیرنے کی بہترین اور بھرپور کوششیں کی ہیں، لیکن ان لوگوں اور ان جیسے دوسرے مزاح نگاروں کے مقابلے میں میاں مشتاق کے مزاح کا کینوس بہت بڑا ہے۔ Sense in non-sense یعنی بے تکی بات میں سے تک کی بات نکالنے کا ہنر (آرٹ) وہ بخوبی جانتے ہیں اور نہایت سلیقے سے منتخب الفاظ لے کر مزاح کا تاج محل تعمیر کرتے ہیں۔ دیکھنے والے کی نظر ہو تو وہ چاروں کھونٹ سے دیکھ سکتا ہے ورنہ ایک ترشی ترشائی عمارت تو بہرحال صفحۂ قرطاس پر کھڑی ہے جو روشن، چمکدار لفظوں کے نگینوں سے جڑی ہے۔

مشتاق مزاح میں بڑے مشاق ہیں۔ انھوں نے خود ایک جگہ اپنی ذات کا انکشاف اس طرح کیا ہے:

''شگفتہ نگار بھی اپنے پورے وجود سے سب کچھ دیکھتا، سنتا، سہتا اور سہارتا چلا جاتا ہے اور فضا میں اپنے سارے رنگ بکھیر کے کسی نئے اُفق کسی اور شفق کی تلاش میں گم ہوجاتا ہے۔''

یعنی وہ اپنے ماحول و مسائل، لوک روایت، تہذیبی روایت اور کلچر سے بالکل بھی نہیں کٹتے اور حیات کی اوبڑ کھابڑ پگڈنڈیوں سے ذرا بھی نہیں ہٹتے۔ وہ جب کوئی مزاح پارہ تخلیق کرتے ہیں تو تجربے کی دہکتی کٹھالی اور مشاہدے کی بھڑکتی ہوئی بھٹی سے ضرور گزارتے ہیں۔ ''آب گم'' کیا ہے۔ یہ قصّہ نہیں بلکہ مرقع ہے جس میں وہ ایک شخص کی زندگی کے واقعات کو چار سو چار صفحات تک ربر کی طرح کھینچتے چلے گئے ہیں اور ان میں درج حیاتیاتی مرقعوں کو انھوں نے Fact+Fiction کا نام دیا ہے۔ یہ اپنے حجم میں ایک ناول کی طرح ہے، مگر کوئی مزاحیہ ناول نہیں بلکہ ایک طویل خاکے کی شکل میں طنز و مزاح کی خاموش مووی ہے، مگر جس کا ہر لفظ بولتا ہے اور بلبل ہزار داستان کی طرح بولتا ہے۔ پرانی نسل کے زندہ نقاد مسٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہنسی پیدا کرنے والے واقعات تو ہما شما سب نکال لیتے ہیں، لیکن زبان کو اس طرح برتنا کہ تضاد، تناسب، توازن کے ذریعے ہنسی والی بات بن جائے، ہر ایک کا کام نہیں۔''

مشتاق احمد یوسفی ان تینوں جہتوں سے مزاح لطیف اور طنز ملیح کی فضا پیدا کرنے میں پوری طرح قدرت رکھتے ہیں اور کیوں نہ رکھیں، ذخیرۂ الفاظ ان کے پاس ہے اور گنجِ تراکیب کی کنجیاں ان کی ازار میں لٹکی رہتی ہیں۔ بلاشبہ وہ الفاظ کے اسٹاک واستعمال میں انیسؔ و جوشؔ کے ہم پلہ ہیں۔ ان کے مزاح کی تہہ داری الفاظ کے برمحل استعمال میں ہی منحصر ہے اور یہ تو مسلمہ و مصدقہ امر ہے کہ طنز و ظرافت کی دنیا میں داخلے کے لیے لفظوں کی مزاج شناسی بہت ضروری ہے کیونکہ اسی سے مزاح نگار کے اسلوب میں جان پڑتی ہے اور یک گونہ شان پیدا ہوتی ہے۔ پھر طنز و مزاح کو مزید نمایاں کرنے اور ان میں پرکشش لطافتیں پیدا کرنے کا ان میں ایک شعور نیام خوبی اور بھی ہے وہ معروف اشعار اور زبان زد مصرعوں میں لفظی ترمیم واضافہ کرکے یا تراکیب میں کتر بیونت کرکے عبارت کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں مثلاً:

(الف) ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب انسان میں اپنے آپ پر ہنسنے کا حوصلہ نہیں رہا اور دوسروں پر ہنسنے سے اسے ڈر لگتا ہے۔
نہ کوئی خندہ رہا اور نہ کوئی خندہ نواز''

(ب) ''اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسار رائے کرنا.... بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوبصورت عورت کی عمر دریافت کرنا۔ ایک صاحب اپنی پسند کے جواب میں یہ کہہ کر چپ ہوگئے کہ
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی''

پھر اردو ادب کا ادنیٰ قاری بھی ان کی پُر مزاح تحریروں اور ظرافت رنگ عبارتوں کو پڑھ کر یہ فتویٰ دے سکتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی شائستہ اور نہایت شائستہ سلیقہ مندی رکھتا ہے۔ اس نے گھٹی میں تہذیبی بصیرت اور کلچر کا خمیر نوش جان کیا ہے۔ وہ منظر کے ساتھ پس منظر بھی لے کر چلتا ہے کیونکہ مشرقی تہذیب کی روایات اس سے چھٹائے نہیں چھوٹتیں۔ یوسفی

صاحب نے خود کہا ہے کہ ''ایشیائی ڈرامہ کا ولن اس کا ماضی ہے۔'' اختر شیرانی نے اپنی شہرۂ آفاق نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' میں اپنی زندگی کی جوالٹی فلم چلائی تھی، اس نے بہت سوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ مشتاق بھی اکثر ماضی کے صحرا میں بھٹک جاتے ہیں اور تشنگی کو بجھانے کے لیے نخلستان کی کھوج میں جا بجا اٹک جاتے ہیں۔ مسکراہٹیں بکھیرنے والا شبنمی قطروں کی سوغات بھی مزاح مزاح میں سونپ جاتا ہے۔ ذرا یہ بات پڑھیے:

''گھر کے سامنے مولسری کا درخت لگانے کو تو لگا لیا، لیکن یادوں کی مولسری کی بھینی بھینی مہک پھبن اور چھب چھاؤں کچھ اور ہی تھی۔ وہ انواع واقسام کے پھول کہاں....؟ کہ ہر پھول سے اپنی ہی خوشبو آئے.... اور وہ گلیاں، بازار، محلّے، آنگن.... دوستوں سے چرچراتی چارپائیاں.... ہری بھری نبولیوں سے لدے پھندے نیم کی چھاؤں، آموں کے بور، ہرنوں سے بھرے جنگل، چھرّے سے زخمی ہوکر دو تین سو فٹ کی بلندی سے گدسے گرتی ہوئی مرغابی، خس کی ٹٹیاں، گلے سے پھسلتا مخملی فالودہ، مولسری کے گجرے، وہ صندلی باہیں جو سوتے جاگتے تکیہ تصور تھیں، تازہ کلف لگے دوپٹے کی کراری مہک.... ماضی کے کوہِ ندا سے بلاوے ایسی صدائیں آنے لگیں۔''

آپ اسے خامی کہیں یا خوبی قرار دیں۔ باتوں باتوں میں یوسفی اپنے متروک وطن میں پہنچ جاتے ہیں اور کوسوں دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام تو ہجرت کا دکھ سہہ کر بادشاہ وقت بن گئے تھے۔ یوسفی بھی ٹونک شریف کی سرزمین سے باہر نکل کر مملکتِ طنز ومزاح کے بے تاج بادشاہ بن گئے ہیں۔ ''آبِ گم'' کی اشاعت نے ہی ان کو اورعالیجاہ، عالم پناہ بنادیا تھا۔ پانچویں کتاب کے منظرعام پر آنے پر وہ اور قومی ہیکل ہوگئے یعنی وہ اقلیم ادب کے شہنشاہ کی صورت میں نمودار ہوگئے۔ ان کی مزاح نگاری پر تبصرہ کرنا گویا قلم کو آٹھ آٹھ آنسو رُلانا ہے۔ ان کی تحریریں ثنا وصفت سے مستغنی ہیں اور وہ خود تحسین وتوصیف کی دولت سے ثروت مند ہیں۔ استاذ الاساتذہ ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی نے اپنے ایک شعر میں ایک سخن گسترانہ بات کہی تھی۔ ایک لفظی ترمیم سے یہ شعر مشتاق صاحب اپنے آپ پر فٹ کر سکتے ہیں کہ پھر بات سخن گسترانہ نہ رہ کر حقیقت بن جائے گی:

ہم نے زمینِ ''نثر'' کو زرخیز کر دیا
جو نخل بودیا اسے گلریز کردیا

○○

سائنس کے دلچسپ مضامین

اس کتاب کے مصنف محمد خلیل بنیادی طور پر ایک سائنس داں ہیں۔ انھوں نے طویل عرصے تک مرکزی حکومت کے زیر انتظام شائع ہونے والے میگزین ''سائنس کی دنیا'' کی ادارت کی ہے۔ وہ اس بات سے بڑی حد تک واقف ہیں کہ بچوں کے لیے کس طرح کے سائنسی مضامین پیش کریں۔ اس کتاب میں انھوں نے سادہ اور سہل انداز میں بچوں کو سائنس کی باتیں بتائی ہیں اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ سائنس کوئی مشکل موضوع نہیں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان موضوعات کو منتخب کیا ہے جو ہمارے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں اور باتوں باتوں میں بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس کی ترقیات نے انسانی زندگی پر بڑا مثبت اثر ڈالا ہے اور انسانی زندگی کے اکثر شعبے سائنس کے اثرات سے خالی نہیں ہیں۔ اس کتاب میں شامل بعض مضامین ایسے ہیں جو بچوں کے ساتھ بڑوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کریں گے۔

مصنف: محمد خلیل صفحات: ۸۰، قیمت: تیس روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی